

ناولزحجب

زیندہ

طبیعی رساجک

ناولزحجب
Novelshub

www.novelshub.pk

قسط نمبر: ۲

موسم سرما کی پہلی بارش کچھ دیر پہلے شروع ہوئی تھی۔ آسمان پر کالے بادلوں کا راج تھا۔ بادل برسنے کے ساتھ ساتھ گرج بھی رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بجلی چمکنے سے رات میں دن کا سماں لگتا تھا لیکن پھر فوراً اندھیرا چھا جاتا۔ گناہوں کی سیاہی سے بھی سیاہ اندھیرا۔

ایسے میں اس درمیانے درجے کے گھر کی چھت پر وہ لڑکی دنیا جہاں سے بے خبر آنکھیں بند کئے بارش کے قطروں کو چہرے پر گرتا محسوس کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں صبح اپنی دوست سے کیں باتیں بھی گونج رہی تھیں۔

”بابا کہتے تھے۔۔۔۔۔ لڑکیاں تلخ نہیں ہوتیں۔ لڑکیوں کو یہ معاشرہ تلخ بناتا ہے۔ ان پر روک ٹوک کر کے، طرح طرح کے سوال پوچھ کے۔ اسی وجہ سے لڑکیاں غصے میں بہت سی ایسی تلخ باتیں کہہ جاتیں ہیں جو معاشرے کے لوگوں کو چابک کی طرح لگتی ہیں۔ شایہ مجھے لگتا ہے میں کبھی کبھی کچھ زیادہ ہی تلخ ہو جاتی ہوں۔“

”زینب، صبر کرو۔ اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنا سیکھو۔ لوگ باتیں کرنے سے پہلے ہم سے اجازت نہیں لیتے کہ ہم یہ بات کہہ لیں؟ انہوں نے جو کہنا ہوتا ہے کہہ جاتے ہیں۔ ہمیں ہی اپنے اندر برداشت پیدا کرنے کی ضرورت

”ٹھیک ہے آپی آرہی ہوں۔“

بجھے دل کے ساتھ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ حالانکہ سردیوں کی بارش تھی لیکن زینب پر تو جیسے فرض تھا ہر بارش میں بھیگنا۔

تھوڑی دیر بعد وہ شاہ لے کر ڈریس کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ لمبے سیاہ بال جو کمر تک آتے تھے۔
”ابھی تو تم بچ جاؤ گی۔ صبح ناشتے کی ٹیبل پر تمہاری یہ سرخ ناک دیکھ کر اماں سے ہمیں ہی باتیں سننے کو ملیں گی۔“

غزل نے اسے دیکھتے ہوئے طنزیہ کہا تھا۔ تھی وہ اس سے دو سال چھوٹی لیکن باتوں میں وہ اس سے کہیں زیادہ بڑی تھی۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ ڈبل سٹوری بیڈ کے نچلے حصے میں لیٹی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
”اگر تم چپ رہو گی تو کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں بارش میں بھیگی تھی۔“
”ویسے زینب تم پاگل ہو۔ تمہیں کس نے کہا تھا سردیوں کی بارش میں بھیگو؟“

وانیہ اس کیلئے ٹرے میں کھانا لاتے ہوئے بولی۔ وہ چھت پر تھی تو ان دونوں نے کھانے کی میز پر یہ کہہ دیا تھا کہ وہ پڑھ رہی ہے۔ البتہ غزل نے بڑی مشکلوں سے اپنا منہ بند رکھا تھا۔

زینب اس بات پر خاموش رہی اور برش ڈریس پر رکھ کر ان کے ہاتھ سے ٹرے پکڑی۔ پھر وانیہ کے سنگل بیڈ پر جا کر وہاں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور کھانا کھانے لگی۔

”آپی، مجھے صبح مت اٹھائیے گا۔“

زینب کی خاموشی کو نوٹ کرتے ہوئے غزل نے بات کا رخ پلٹا۔

”کیوں اب تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”بارش ہوئی ہے۔ ٹیچر سے کہوں گی پانی کھڑا تھا گلی میں۔“

”کیوں چاہتی ہو صبح موحد سے خود سری کا الفاظ دوبارہ سنو میں۔“

وانیہ کی بات سن کر زینب کا نوالہ بناتے ہاتھ تھما تھا۔ دل یک دم اچاٹ ہو گیا۔ لیکن وہ پھر بھی کھانا کھاتی رہی ورنہ مزید سوالات کے جوابات دینے پڑتے۔

”میں چھٹی کا موقع نہیں جانے دوں گی۔ موحد بھائی تو کہتے رہتے ہیں۔ آپ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینا۔“

بڑی سمجھداری سے مشورہ دے کر اس نے جلدی سے منہ تک کمبل اوڑھ لیا مبادا وانیہ کچھ اور ہی نہ کہہ دے۔ وانیہ نے اس کو ایسا کرتے دیکھ کر سر جھٹکا اور کمرے کے آدھے سے کم حصے میں لگے پردے کو ہٹایا۔ پیچھے دو بڑے بڑے ٹرنک اور ان پر گتے کے ڈبوں میں کچھ سامان رکھا تھا۔ ان کے آگے چوڑائی والے حصے میں اس دیوار سے دوسری دیوار تک رسی لگی تھی جس پر استری شدہ کمرے لٹک رہے تھے۔ کونے میں تین، چار کمبل تہہ در تہہ رکھے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر اوپر والا کمبل اٹھایا اور واپس کمرے والے حصے میں آئی۔

اتنی دیر میں زینب کھانا کھا کر برتنوں سمیٹ کمرے سے غائب ہو چکی تھی۔ وانیہ لائٹ آف کر کے اپنے سنگل بیڈ پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور زینب اندر آئی۔ نیم اندھیرے میں اپنا کمبل لے کر وہ ڈبل سٹوری بیڈ کے زینے چڑھنے لگی۔ کمبل اچھی طرح خود پر اوڑھنے کے بعد وہ چھت کو گھورنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کے وجود پر کپکپی طاری ہو گئی لیکن وہ نظر انداز کئے چھت کو تکتی رہی۔ اس کے زہن میں کچھ دیر پہلے وانیہ کی کہی

”کیوں چاہتی ہو صبح موحد بھائی کے منہ سے خود سری کا الفاظ دوبارہ سنوئیں۔“

اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بھینگے لگے۔ بے اختیار وہ اللہ سے شکوہ کر گئی تھی۔

”آخر کیوں یہ دنیا والے ہمیں جینے نہیں دیتے۔ کیوں ہمیں یہ الفاظ روز روز سننے پڑتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ ہم یتیم ہیں۔ ہمارے سر پر اب باپ جیسا مضبوط سایہ نہیں ہے۔ ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی بھائی نہیں ہے صرف اسی لئے۔ بالکل صحیح کہتے تھے بابا لڑکیاں اتنی بے مول نہیں ہوتیں جتنا معاشرہ انہیں بنا دیتا ہے۔ آئی مس یو بابا۔ آئی ریلی مس یو۔“

اور یہ کہتے ہی زینب نے اپنی آنکھیں بند کر دی پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ دو سال ہو گئے تھے ان کے والد کی وفات کو۔ ان دو سالوں میں کوئی ایک بھی ایسا دن نہیں گزرا تھا جب زینب اپنے والد کو یاد کئے بنا ہی سو گئی ہو۔

مصطفیٰ صاحب کی وفات کے بعد ان کے تینوں بیٹے انہیں کے چھوڑے گھر میں رہ رہے تھے۔ جوان کے بڑے بیٹے کی نام تھا۔ خالد صاحب سب سے بڑے تھے ان کی شادی عقیفہ بیگم سے ہوئی تھی اور ان کی تین بیٹیاں

وانیہ اور زینب نے مل کر سلام کیا۔ زینب چپ کر کے بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی اور وانیہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”غزل کدھر ہے۔۔۔۔۔؟“

”وہ چچا جان۔۔۔۔۔“

”چچا جان سکول میں کوئی مقابلہ تھا۔ وہ حصہ نہیں لینا چاہتی تھی اسی لئے اُس نے آج چھٹی کر لی۔“

اس سے پہلے ہی پر اٹھالے کر آتی وانیہ نے انہیں جواب دیا تھا۔

”لیکن یہ کونسی بد تمیزی ہے کہ اُس نے ناشتے کی ٹیبل پر ہی آنا گوارا نہیں کیا۔۔۔؟“

اب کی بار موحد تیز آواز میں بولا۔ وہ خوش شکل سانو جوان وقاص صاحب کی دائیں طرف پہلی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی اس کی چہرے پر سخت تاثرات ابھرے تھے۔ سیاہ آنکھوں میں بھی ناگواری در آئی۔

”موحد۔۔۔۔۔!“

وقاص صاحب نے اسے دیکتے ہوئے آنکھوں میں ہی تنبیہ کی۔

”لیکن ابا۔۔۔۔۔“

”چچا جان، میری وین آگئی ہے۔ میں چلتی ہو۔“

اس سے پہلے کے موحد کچھ بولتاوین کی آواز سن کر زینب جلدی سے اٹھی۔

”اللہ حافظ۔۔۔۔۔“

کہہ کر اس نے اپنی شال اور بیگ اٹھایا۔ مسز خالد کی کرسی کے پاس رُک کر جھکتے ہوئے ان نے پیار لیا اور لاؤنج میں آئی۔ شال اوڑھ کر وہ باہر کی طرف جانے ہی لگی تھی جب۔۔۔۔۔

”زینب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

آواز پر وہ رُکی۔ گہری سانس لے کر وہ مڑی اور فرصت سے سامنے والے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ جانتی تھی اس شخص کے علاوہ اس کے پیچھے کوئی نہیں آئے گا۔

”یہ لو، کچھ پیسے رکھ لو۔ تم نے صبح سے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ کالج سے کچھ لے کر کھا لینا۔“

اس نے پیسے اس کی طرف بڑھائے۔ وہ اکثر اسے پیسے دیا کرتا تھا۔ زینب نے مسکرا کر ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے ہاتھ سے وہ پانچ سو کانوٹ پکڑا۔

”شکریہ ایان بھائی۔۔۔۔۔“

مسکرا کر کہتی وہ باہر کی طرف بڑھی۔ ایان تب تک ایسے ہی دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ پھر سر جھٹک کر کمرے کی طرف بڑھا۔ اسے صرف زینب کی ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھنی تھی جو وہ کبھی کبھی ہی دیکھ پاتا تھا اور جس مسکراہٹ کا کسی نے اس سے وعدہ لیا ہوا تھا۔

”شنایہ، اگر چچا جان نے میرے آگے پڑھنے پر اعتراض کیا تو میں کیا کروں گی پھر۔“

کالج کے فری پیریڈ میں وہ دونوں خالی میدان میں آگئی تھیں۔ جہاں کھیلوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے زینب نے اپنا ڈرا سے بتایا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ وانیہ آپ نے بھی تو پڑھا ہے نہ پھر تمہارے پڑھنے پر انہیں اعتراض کیوں ہو گا۔“

”وانیہ آپ نے بابا کی زندگی میں ہی اپنی پڑھائی مکمل کر لی تھی۔ بس لاسٹ سمسٹر تھا جو انہوں نے بعد میں پڑھا تھا۔“

زینب نے اسے دیکھتے ہوئے خاصہ جتایا تھا۔

”تم فکر نہ کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

کہتے ہوئے وہ ایک پلر کے ساتھ قدرے دھوپ والی سائیڈ پر بیٹھ گئی۔ زینب بھی اسی کے ساتھ بیٹھی۔

”کوئی بات نہیں۔ میں کروادوں گی تمہارا ایڈ مشن اور وہ ایان صاحب کے دیے جانے والے پیسے بھی تو ہیں نہ تمہارے پاس۔۔۔۔۔۔“

شایہ نے اس کے ہاتھ سے پیسے جھپٹنے والے انداز میں پکڑے تھے۔ پھر اوپر کر کے روشنی میں وہ نوٹ دیکھنے لگی۔

اس نے اسے ٹوکا۔ پہلے پہلے وہ دونوں یہی سمجھتی تھیں کہ وہ جعلی نوٹ دیتا ہے لیکن اب زینب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اصلی ہی ہیں۔ لیکن شاید ابھی بھی تجسس کے مارے چپک ضرور کرتی تھی۔

اس نے مایوسی سے وہ نوٹ زینب کو پکڑا دیا۔

اس سوال کا جواب زینب کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس لئے پلر سے سرٹکا کر آنکھیں موند گئی۔ شروع شروع میں

زینب از قلم طیب ساجد

”تم کل رات پھر بارش میں بھیگی تھی۔۔۔؟“

”ہاں، لیکن پلیز میں اس وقت لیکچر سننے کے موڈ میں ہوں۔“

کہہ کر وہ اٹھی اور کینیٹین جانے والے راستے کی طرف بڑھی۔ تھوڑی دیر کی بعد وہ دوبارہ آئی اور اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

زینب نے آنکھیں کھولیں۔ شایہ کے ایک ہاتھ میں فرائز جبکہ دوسرے ہاتھ میں سمو سے کی پلیٹ تھی۔

”اچھا، پہلے کھالو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا سب۔“

شاید نے آرام سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ زینب چپ ہو کر اس کے ساتھ فرائز کھانے لگی۔

”بیٹا، بیٹیوں کو خاموش رہنا پڑتا ہے۔“

”کیوں بابا، ہم ہی کیوں۔؟“

وہ نویں کلاس میں تھی جب اس نے یہ سوال اپنے بابا سے پوچھا تھا۔

”کیونکہ بیٹا، لڑکیوں کی عزت سوکھے پتے کی مانند ہوتی ہے۔ لڑکیوں کو چاہیے وہ خود ہی شروع سے اپنے نفس پر

قابور کھنا سیکھیں۔ سیکھو گی نا تم۔۔۔۔؟“

اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے ان کے بوڑھے ہوتے ہاتھ تھامے تھے۔

”جی بابا، سیکھو گی۔ لیکن آپ یہ سب وانیہ آپنی اور غزل کو کیوں نہیں بتاتے۔۔۔۔۔؟“

اس کی بات سن کر ان کے چہرے پر اُداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”بیٹا، میں آپ تینوں کو یہ باتیں بتاتا ہوں لیکن علیحدہ علیحدہ۔“

”لیکن وہ کیوں بابا۔۔۔۔۔؟“

وہ حیران ہوئی تھی۔

”کیونکہ بیٹا، میں اکٹھے میں بتاؤں تو اگر میری ایک بیٹی عمل کرے گی تو دوسری اسے دیکھ کر کہے گی ’دیکھا بابا کی

نظر میں اچھا بننے کیلئے اس بات پر عمل کر رہی ہے۔‘ میں نہیں چاہتا میری بیٹیاں بد زبانی کریں۔ میں چاہتا ہوں

میری ہر بیٹی اپنی جگہ پر اپنی عزت کی حفاظت کرنا سیکھے اور خود سیکھے کسی دوسرے کو دیکھ کر نہیں۔ لیکن بیٹا،

کبھی بھی اپنے منہ سے ایسے الفاظ نا نکالنا جسے سن کر کسی دوسرے کو تکلیف ہو۔“

خالد صاحب نے واقعی اپنی بیٹیوں کی زہن سازی اچھے طریقے سے کی تھی۔ اس وقت وہ چھت پر چارپائی پہ

بیٹھی اپنے بابا کے الفاظ یاد کرتی روئے جارہی تھی۔

کالج سے آکر اپنے کپڑے بدل کر وہ سیدھا چھت پر آئی تھی اور اب روئے جارہی تھی وجہ-----
کالج کے باہر ایک لڑکے کا روزانہ اسے دیکھنا تھا۔ وہ جب تک وین کا انتظار کرتی تھی وہ تب تک کھڑا اسے ہی دیکھتا رہتا تھا اور آج تو حد ہی ہو گئی۔

وہ چل کر اس کے پاس آ رہا تھا وہ تو شکر تھا اسی وقت وین والے انکل آئے اور اس نے وین میں بیٹھ کر سکون کا سانس لیا۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کس کو بتائے۔ اس لئے بیٹھ کر روئے جارہی تھی۔
”زینب-----“

ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا۔ مسز خالد چلتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھیں۔
”امی آپ-----“

اس نے جلدی سے آنسو صاف کئے اور بال سمیٹنے لگی۔
”ہاں بیٹا، میں۔ دھوپ اچھی نکلی ہوئی تھی تو سوچا گھٹنوں کو لگوا آؤں۔“
وہ آکر چار پائی پر بیٹھیں تو وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ انہوں نے پیار سے اس کے بال ماتھے سے ہٹائے۔

”بتاؤ، اب۔ کیوں رو رہی تھی۔۔۔؟“
ان کی بات سن کر اس کی آنکھیں پھر سے بھگنے لگی۔
”امی ایک لڑکا دو ہفتے سے مجھے کالج کے باہر کھڑا ہو کر گھورتا ہے۔“

”بیٹا، ہم ان کے احسانات تلے دبے ہیں۔ ہم اس گھر میں رہ رہے ہیں۔ یہی بہت ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن امی یہ گھر تو ابھی بھی بابا کے نام پر ہی ہے نہ پھر کیوں اس گھر میں ہم پر جگہ تنگ ہے۔۔۔“

زینب کے کہنے پر انہوں نے نظریں چرائیں۔ زینب سے یہ سب چھپ نہ سکا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی۔

”امی، آپ کچھ چھپا رہی ہے نا مجھ سے۔ کیا یہ گھر ابھی بھی بابا کے نام پر نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔“

آخری جملہ کہتے اُس کی اپنی آواز بھی کانپی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے ہمت کر کے کہا۔ زینب نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”یہ گھر تمہارے بابا نے اپنی ہی زندگی میں میرے نام کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب ان سب نے پتہ کروایا تو انہیں پتہ چل گیا کہ یہ گھر میرے نام ہے۔ پچھلے سال انہوں نے مجھ سے یہ کہہ کر گھر اپنے نام کروالیا تھا کہ یہ میری بچیوں کو پڑھائیں اور ان کی شادی کی ذمہ داریاں بھی پوری کریں گے۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ لوگ میری بیٹیوں کو طعنہ دیں گے۔ میں بھی بہت بے بس ہوں زینب۔۔۔۔۔“

ہولے سے اپنی بات مکمل کرتے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زینب ابھی بھی نفی میں سر ہلاتی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

”امی آپ سب کو جانتی تھی۔ آپ کو پتہ تھا یہ سب کیسے ہیں۔ لیکن پھر بھی۔ آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔ او خدا یا۔۔۔۔۔۔۔“

”ششش۔۔۔۔۔۔۔ وانیہ اور غزل کو خبر بھی نہیں ہونی چاہیے کہ ایسا کچھ ہوا ہے سمجھی۔۔۔۔۔۔۔“

”کس کے نام پر ہے اب یہ گھر۔۔۔۔۔“

”وقاص بھائی اپنے بچے کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ گھر موحد کے نام کر دیا تھا۔“

”اس لئے موحد بھائی ہمیں کچھ نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ہم بیوقوف بچیاں ہیں جن کی ان کی نظر میں رتی

اپنوں کی بے حسیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔“

آنکھوں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے وہ ادھر ادھر ٹھہرتی دل ہی دل میں اپنے بابا سے مخاطب تھی۔

اگلے دن جب وہ کالج کے ٹائم سے فارغ ہو کر باہر آئی تو اس نے اس لڑکے کو روزانہ کی طرح وہاں کھڑا پایا۔ اسے دیکھتے ہی زینب کو غصہ آیا لیکن پھر ضبط کرتی اس کی طرف بڑھی۔ وہ لڑکا اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر واضح چو نکا تھا۔ بلیو جینز پر بلیک شرٹ پہنے وہ دیکھنے میں کافی ہینڈ سم معلوم ہوتا تھا۔ اُسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ جو اپنی بایک سے ٹیک لگائے کھڑا تھا فوراً سیدھا ہوا۔

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں روزانہ ادھر کھڑے ہو کر آپ کا مجھے گھورنے کا مقصد کیا ہے۔۔؟“

اس کے پاس پہنچ کر زینب نے سیدھے سیدھے پوچھا۔ سامنے والا پہلے تو اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا پھر چند لمحے خاموش رہا۔

”اوہ مسٹر۔۔۔۔۔ میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

جب وہ کچھ نہ بولا تو زینب نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

”وہ دراصل میں۔۔۔۔۔۔۔“

ابھی وہ کچھ بولتا جب اس کی نظر زینب کے ہاتھ کی طرف اٹھی جہاں شہد کی مکھی بیٹھی تھی پھر اس نے زینب کی طرف دیکھا جو سوالیہ نظروں سے اس کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر زینب کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ زینب کو کرنٹ لگا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھا اور اس نے سامنے والے کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔

”ہاؤڈیو۔۔۔۔۔۔۔ ہمت کیسے ہوئی تمہاری مجھے چھونے کی۔ تمیز نام کی چیز ہے تم میں۔“

وہ فوراً آپ سے تم پر آئی تھی۔ زینب کا تنفس ایک دم تیز تیز چلنے لگا۔ اُسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ سامنے والا

حیرت سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے اسے دیکھ رہا تھا۔ ادھر ادھر سے کچھ طلباء ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کچھ نظر انداز کر کے گزرتے رہے۔

”آئینہ مجھے گھورنے اور چھونے سے پہلے سودفعہ سوچنا۔ لڑکیاں ہیں ہم تم جیسے مردوں کی غلام نہیں کہ جیسا چاہا ویسا سلوک کر لیا۔ عام لڑکیوں کی طرح بزدل نہیں ہوں میں۔ سمجھے۔۔۔“

انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتی ایک قہر آلود نظر اس پر ڈال کر وہ اپنی دین کی طرف بڑھی جو ابھی ابھی آئی تھی۔ پیچھے وہ ہکا بکا اپنے منہ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہ گیا۔

وقت گزر رہا تھا۔ دن آہستہ آہستہ کر کے گزرتے رہے اور زینب ان دنوں میں بہت مصروف رہی۔ پیپرز کی تیاری میں دن رات جاگتی رہتی۔ پھر وہ دن بھی آگیا جب زینب اپنا آخری پیپر دے کر گھر آئی۔ اس نے تیاری بہت اچھی کی تھی بس اسے اب رزلٹ کا انتظار تھا۔

”امی، امی۔۔۔۔!“

فارغ وقت کا فائدہ اٹھا کر وہ مسز خالد کو آواز دیتی ان کے کمرے میں چلی آئی۔ پیپرز کی مصروفیت کی وجہ سے وہ کسی کو بھی سہی سے وقت نہیں دے پارہی تھی۔ اب موقع ملا تو ان کے کمرے میں چلی آئی۔ شام کا وقت تھا

سب اس ٹائم لان میں تھے۔ بس ان ماں بیٹیوں کو بلانا گناہ سمجھتے تھے۔ غزل اور وانیہ تو پھر چلی جاتی لیکن زینب کا اب ان کی ساتھ بیٹھنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا۔

”ہاں بیٹا،۔۔۔“

وہ جو کمرے کی چیزیں درست کر رہیں تھیں اس کی آواز پر جواب دیتے بیڈ پر آکر بیٹھی۔

”امی، کتنی دفعہ کہا ہے۔ ہمیں بلالیا کریں۔ طبیعت آپ کی پہلے ہی ٹھیک نہیں رہتی اوپر سے آپ کام بھی کرتی رہتیں ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت اپنی طبیعت کا احساس کر لیا کریں۔“

انہیں بیڈ کر اوٹن سے ٹیک لگا کر بیٹھاتے ہوئے وہ تھوڑا غصہ کر گئی۔

”بس بیٹا، اب کیا چھوٹی چھوٹی باتوں پر تم لوگوں کو آواز دیتی پھرو۔ اللہ بس کسی کا محتاج نہ کرے۔ تم بتاؤ کیسے ہوا آج کا پیپر۔۔۔۔؟“

”اللہ کا شکر ہے باقی سب پیپر زکی طرح بہت اچھا ہوا ہے۔ بس اب ایک دفعہ زلٹ آجائے پھر یونیورسٹی میں داخلہ لوں گی۔“

”محنت جو اتنی کی تھی تم نے اچھا ہی ہونا تھا اور بیٹا مجھے بتاؤ۔ کیا میں کروں وقاص بھائی سے تمہاری یونیورسٹی کے متعلق بات۔۔۔۔۔؟“

”نہیں امی، کب تک آپ ہمارے لئے کھڑی ہوگی۔ اب ہمیں اپنے لئے خود کھڑا ہونا ہے۔ میں چچا جان سے خودی بات کر لوں گی۔“

اس نے پیار سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما تھا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ مجھے یہ بتائیں میرے پیپرز کے دنوں میں میڈیسن وقت پر لیتی رہی ہیں نہ آپ۔۔۔۔۔؟“

اس کا لہجہ یک دم ہی فکر مندانہ ہو گیا۔

”ہاں لیتی ہوں۔ تم ٹینشن نہیں لیا کرو۔ بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور خود کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

پھر وہ اسے ہمیشہ کی طرح کچھ باتوں کی تاکید کرتیں رہیں۔ وہ چُپ چاپ ان کی ہر بات سن کر سر ہلاتی رہی۔ کچھ دیر بعد جب وہ سو گئی تو وہ آہستہ سے اٹھی اور کمرے کی لائٹ بند کر کے دبے پاؤں باہر آئی۔

پانچ منٹ کے بعد وہ اسٹڈی کے دروازے کے باہر کھڑی دیکھائی دی۔ ڈوپٹہ ٹھیک کر کے اس نے گہری سانس لی۔ وہ جانتی تھی لان میں چائے پینے کے بعد چچا جان اب اپنی اسٹڈی میں کام کر رہے ہوں گے۔ دروازہ ناک کر کے اس نے اجازت ملنے کا انتظار کیا۔

“آ جاؤ_____”

اگلے ہی لمحے اندر سے وقاص صاحب کی آواز گونجی۔ اس نے ناب گھما کر دروازہ کھولا تو یک دم ٹھٹک کر رُکی۔ اندر منان اور موحد اسٹڈی ٹیبل کے دائیں جانب رکھی گرسیوں پر براجمان تھے۔ ٹیبل پر کچھ فائلز پڑی تھیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ آج وہ دونوں بھی چچا کے ساتھ کام میں مصروف تھے۔ وہ جلدی سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

”سوری چچا جان، میں بعد میں آ جاؤں گی۔“

زینب از قلم طیبہ ساجد

”نہیں زینب، کوئی بات نہیں۔ تمہیں کوئی ضروری بات کرنی ہے تو آؤ۔۔۔۔“

وقاص صاحب نے اسے پلٹتے دیکھ کر فوراً کہا۔ وہ مڑی اور منان، موحد کو دیکھنے لگی جو اسی کی طرف متوجہ تھے۔
”لیکن۔۔۔۔۔“

”زینب ان سے کیوں گھبرار رہی ہو۔ وہ تمہارے بھائیوں کی طرح ہیں۔“

وقاص صاحب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ کر کہا۔ زینب نے لمحے بھر کو سوچا۔ یونی کی بات ہی کرنی تھی۔ اچھا ہے ان کے سامنے ہی ہو جائے تاکہ بعد میں علیحدہ سے ان کا جازت نامہ پُر نہ کروانا پڑے۔ کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے زینب چپ چاپ چلتی ہوئی میز تک آئی اور ان کے سامنے گرسی کے کنارے پر ٹک گئی۔
”میں نے سنا ہے آج تمہارا لاسٹ پیپر تھا۔ کیسے ہوئے تمہارے پیپر۔۔۔۔۔؟“

وہ بہت غیر آرام دہ نظر آرہی تھی اسی لئے انہوں نے ہی بات کا آغاز کیا تاکہ وہ نارمل ہو جائے۔ موحد اور منان بظاہر فائلز دیکھ رہے تھے لیکن ان کے کان ادھر ہی متوجہ تھے۔
”اللہ کا شکر ہے چچا جان۔ اچھے ہوئے ہیں میرے پیپر۔۔۔۔۔“

”اچھی بات ہے۔ آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔۔۔؟“
وہ ٹیبل پر آگے کو جھکے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
”جی۔۔۔۔۔۔۔“

زینب نے نا سمجھی سے پوچھا۔

”مطلب کے آگے یونیورسٹی جانے کا ارادہ ہے بیٹا۔۔۔؟“

وہ نرمی اور اپنائیت سے پوچھ رہے تھے اور زینب نے بے حد بے یقینی نے انہیں دیکھا۔ وہ یہی تو کہنے آئی تھی۔ اُس نے یہی تو ابھی نہیں کہا تھا۔ وہ کیسے سمجھ گئے تھے کہ وہ یہ کہنا چاہتی تھی۔ کیا کچھ دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہوتیں ہیں۔۔۔؟ بالکل اگر نیت صاف ہو تو دعائیں بہت جلد قبول ہوتیں ہیں۔ کسی نے اس کے اندر سرگوشی کی تھی۔

”زینب۔۔۔۔۔“

جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو کچھ وقت کی خاموشی کی بعد انہوں نے اسے پکارا۔ زینب ہوش میں آئی۔

”جی جی چچا جان، مجھے آگے پڑھنا ہے۔ یونیورسٹی میں ایڈمشن لینا ہے۔“

وہ جب بولی تو اس کی آواز میں زمانے بھر کی خوشی تھی۔

”کیا پڑھنا چاہتی ہو تم۔۔۔؟“

”چچا جان، آگے مجھے ایم بی بی ایس کرنا ہے۔ اُس کیلئے مجھے پہلے انٹری ٹیسٹ پاس کرنا ہو گا اور۔۔۔۔۔“

وہ روانی سے مزید بتا رہی تھی جب موحد نے اس کی بات کاٹی۔

”کیا ضرورت ہے اتنی کھپائی کرنے کی اور خرچہ الگ۔ کوئی آسان سی فیلڈ پڑھ لو۔ ہم نے کونسا تم سے نوکریاں کروانی ہیں۔“

”موحد۔۔۔۔۔“

وقاص صاحب نے اسے ٹوکا۔ پھر زینب کی طرف متوجہ ہوئے۔

”بیٹا جو تمہیں بہتر لگے وہ کرو۔ پڑھائی میں تمہیں مکمل آزادی ہے۔ تم ایم بی بی ایس کرنا چاہتی ہو کرو۔۔۔۔۔“

”اور ایم کیٹ کی تیاری شروع کر دو۔ پھر جب تمہارا نام میرٹ لسٹ میں آجائے تو پہلی فرصت میں میرے پاس آکر اپنی فیس لے جانا۔“

البتہ موحد کے چہرے پر ناگوار تاثرات اُبھرے تھے لیکن کچھ معاملات میں وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔

”جی ٹھیک ہے چچا جان، بہت شکریہ آپ کا۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔“

وقاص صاحب نے مزید پوچھا۔

”جی چچا جان،۔۔۔۔“

“بولو”

”چچا جان اب میں نے یونیورسٹی جوائن کرنی ہے۔ پھر اب میں بڑی بھی ہو گئی ہوں۔ وانیہ آپنی کے علاوہ ہم میں

سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔ مجھے ایک فون دلادیں۔۔۔۔۔“

اس نے معصومیت بھرے اعتماد سے کہا تھا۔ لیکن اب موحد کی برداشت سے باہر تھا۔ اس سے پہلے کہ وقاص صاحب کچھ کہتے موحد دوبارہ تیز آواز میں بولا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے ایسا کرنے کی۔ اب ہم لڑکیوں کو اتنی آزادی نہیں دے سکتے۔ یونیورسٹی میں اگر کبھی ضرورت ہوئی بھی تو وانیہ کالے جانا۔ وہ کونسا ہر وقت میٹنگ کالز پر مصروف رہتی ہے۔“

جہاں زینب کی مسکراہٹ سمٹی وہیں وقاص صاحب نے موحد کو آنکھیں دیکھائیں۔ ساتھ بیٹھے منان نے بھی موحد کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اُس کا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گیا تھا۔

”کس لہجے میں بات کر رہے ہو تم زینب سے۔۔۔۔۔ اور آج کل کی لڑکیوں کو معاشرے میں خود مختار ہونا پڑتا ہے ورنہ معاشرے کا مردان کے حقوق چھیننے میں دیر نہیں لگاتے۔“

پھر وہ زینب کی طرف متوجہ ہوئے۔

”زینب، تم فکر نہیں کرو میں تمہیں موبائل دلادوں گا۔ خود جا کر پسند کرو گی یا میں منگوا دوں۔۔۔۔۔۔“

زینب کی طرف رخ کرتے ان کے لہجے میں پھر شفقت سمٹ آئی تھی۔ اس لئے اس کی مرضی بھی پوچھنے لگے۔

زینب نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ ان کے ابو سے دو سال ہی چھوٹے تھے لیکن وہ کافی فٹ اور خوب رو تھے۔ ان کے چہرے پر ہمہ وقت ٹھہراؤ رہتا تھا جو ان کی شخصیت کا خاصا تھا۔

”چچا جان، آپ ہی منگوا دیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اور ایان کو میرے پاس بھیجو۔ تمہیں رات تک یا کل صبح تک موبائل مل جائے گا۔“

تابع داری سے سر ہلا کر وہ جلدی سے اٹھی اور باہر کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ موحد کی آنکھوں کی تپش کی تاب نہ لاتے ہوئے اسے اچھی خاصی سنا دیتی۔

اس کے جاتے ہی انہوں نے موحد کو گھر کا۔
”لیکن ابو، اتنی مہنگی ڈگری۔۔۔۔۔۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔۔۔ اور آئندہ تم مجھے ان کے ساتھ اس لہجے میں بات کرتے نہ دکھائی دو۔۔۔“

دو ٹوک لہجے میں کہہ کر انہوں نے اپنے سامنے پڑی فائل کھول لی جیسے بس اب وہ مزید بات نہیں سنے گے۔

موحد بس صبر کرتا رہ گیا۔

”لیکن آپ، یونی کا پہلا دن ہے اور یہ کالا رنگ۔۔۔۔۔“

وانیہ نے اب کی بار باقاعدہ خود کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔

”جی آپي۔۔۔۔“

Page 27 | 37

اس نے جتنے آرام سے کہا تھا اوپر بنک پر لیٹی زینب نے اتنی ہی تیزی سے نیچے جھانکا تھا۔

”سچی آپی۔۔۔۔“

وہ خوشی سے چیخی تھی۔

”ہاں سچی۔۔۔“

”واہ زینب واہ۔۔۔۔ اب تو یہ کہنا بنتا ہے کہ ’تم اپنے رب کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔۔۔“

زینب نے سیدھا ہو کر چھت کو تکتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتہ ہے جب میں یونی جاتی تھی نہ تو ابو مجھے ہر ماہ چار سوٹ دلوایا کرتے تھے۔“

وانیہ کی آواز میں اُداسی گھل گئی۔

”ہر ہفتے بعد مجھے یونی سے واپسی پر آئسکریم کھلاتے تھے اور ہر ماہ بعد مجھے شوز بھی لے کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے

گرمی میں بھی جو گرز ہی آپ کے پاؤں کو سیور رکھتے ہیں۔ کھلی جوتی سے پاؤں درد بھی کرتے ہیں اور کالے بھی ہو

جاتے ہیں۔۔۔۔۔“

آخر میں اپنی اپنی جگہ دونوں ہی اُداسی سے مسکرائی تھیں۔ غزل بنک کے نیچے والے حصے میں سو رہی تھی۔

”اچھا آپی، مجھے نہیں پتہ تھا ابو آپ کیلئے اتنا سب کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات میں جانتی ہوں وہ اپنی ہر بیٹی کو

خوش رکھتے تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کو کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔“

”بالکل، وہ دن بہت اچھے ہوتے تھے۔۔۔۔“

”جب ابو تمھارے لئے امی سے _____“

پھر بس دونوں پُرانے دنوں کو یاد کر کے اُن دنوں کی باتیں دہرانے لگیں۔ اور صرف یہی کیا جاسکتا تھا۔ پُرانے دنوں کو یاد کر کے صرف مُسکرایا ہی جاسکتا تھا نہ ان میں جا کر رہا جاسکتا تھا اور نہ انہیں واپس لایا جاسکتا تھا صرف! یاد کیا جاسکتا تھا۔

صبح جلدی جلدی ساری تیاریاں کر کے وہ سات بجے تک ریڈی تھی۔ وہ ناشتے کی ٹیبل پر پہنچی تو وہاں سب ہی موجود تھے۔ کیونکہ آٹھ بجے گھر کے مردوں نے آفس کیلئے نکلنا تھا۔ اس نے وہی رات میں منتخب کیا جوڑا پہن رکھا تھا۔ سیاہ ہی ڈوپٹے کے ساتھ اس نے سُرخ اور سیاہ رنگ کے امتزاج کی اجرک کندھوں پر ڈالی ہوئی تھی۔

”چچا جان، شکریہ آپ کا۔ میرے تعلیمی اخراجات اٹھانے کیلئے۔“

ناشتے پر بیٹھے زینب نے اونچی آواز میں کہا تھا تا کہ سربراہی گرسی پر بیٹھے وقاص صاحب تک آواز پہنچ سکے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کا چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔ صرف آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر ہلکا سا لپ گلوں لگا تھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کے چہرے، خاص کر اس کی شہد رنگ آنکھوں میں کشش تھی جو دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کرتی تھی۔

بہت سی طنزیہ نظروں نے اس کا احاطہ کیا۔ زینب نے دیکھا اُن میں وہیں موحد، اس کی بہن اور چھوٹی چچی شامل تھیں۔

”کوئی بات نہیں بیٹا، بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور خوش رہو۔“

وقاص صاحب نے نرمی سے کہتے ہوئے اخبار کا صفحہ پلٹا۔ مسز خالد نے اسے آنکھیں دیکھائی۔ جن کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔ انہوں نے اس سے کہا تھا کہ اچھے طریقے سے شکریہ ادا کرنا لیکن وہ رکھائی سے بس اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

”چلیں زینب۔۔۔۔۔“

موحد نے اسے آواز دی تو اس نے نظریں اٹھائیں۔ پہلا دن ہونے کی وجہ سے وقاص صاحب نے موحد سے کہا تھا کہ وہ اسے یونیورسٹی چھوڑ آئے اور اس نے بنا کچھ کہے حامی بڑھ لی تھی۔

”جی موحد بھائی۔۔۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے زینب اٹھ کھڑی ہوئی۔

”موحد کچھ کھا لو۔۔۔“

مسز وقاص نے اسے ٹوکا۔ کیونکہ وہ روم سے آکر سیدھا جانے کیلئے تیار تھا۔

”نہیں امی میری ایک کمپنی کے ڈائریکٹر سے میٹنگ ہے مجھے جلدی پہنچنا ہے بعد میں کسی ریسٹورانٹ سے میں کچھ کھا لوں گا۔“

”اچھا بیٹا، یاد سے کھا لینا۔۔۔۔۔“

مسز وقاص نے یقین دہانی کیلئے دوبارہ کہا جس پر موحد نے سر اثبات میں ہلایا۔

”اللہ حافظ۔۔۔“

زینب نے بھی سب کو خدا حافظ کہا اور موحد کے پیچھے باہر کی طرف بڑھ گئی۔

”اللہ ان بچوں کی حفاظت کرے۔“

مسز وقاص نے دل ہی دل میں دعا دی تھی۔ وہ سلجھی ہوئی دھیمے مزاج کی خاتون تھیں۔ سب کی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھیں بس ان کا بیٹی اور بیٹی شروع سے ہی خالد صاحب کی بیٹیوں کے ساتھ ایسا رویہ رکھتے تھے۔ وہ ان کو سمجھاتی تو وہ آگے سے کہتے تھے ’امی آپ کو آج کل کے دور کا نازہ نہیں ہے‘ اور پھر وہ تھک کر چپ کر جاتیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے بیٹے سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو جائے گی جس کی وجہ سے وہ ساری زندگی اس یتیم لڑکی کی قرض دار رہے گی۔

یونیورسٹی میں معمول سے ہٹ کر گہما گہمی تھی۔ ادھر ادھر پھرتے لوگ کسی کو روک کر کبھی اپنی کلاس کا پوچھتے

اور کبھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کا۔ غرض ہر طرف شور اور ہنگامہ تھا۔

یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی وہ ادھر ادھر دیکھ کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کا اندازہ لگانے لگی۔ موحد اسے باہر ہی ڈراپ کر کے چلا گیا تھا۔ وہ بد دماغی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں موحد کی آخری کہی بات گونج رہی تھی۔۔۔۔۔

جب وہ گاڑی سے اترنے لگی تب موحد نے اسے آواز دے کر روکا۔
”دیکھو زینب تمہیں اتنی چھوٹ دے تو دی ہے ابونے۔ لیکن اپنی حد میں رہنا۔ میری نظر ہمیشہ تم پر ہے۔ آئی سمجھ۔۔۔؟“

اور وہ خلاف معمول چُپ کر کے سر ہلاتی باہر نکل گئی۔

اب موحد کی اس بات کے ساتھ ساتھ اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی فکر بھی ہونے لگی تھی۔
”ایک تو پتہ نہیں کیا سسٹم ہے یہاں کا۔ کس سے کیا پوچھو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ شایہ۔۔۔۔۔“
ایک دم سوچتے سوچتے وہ چونکی۔

”ہاں شایہ نہیں پہنچی ابھی تک۔ ہاں ہو سکتا ہے وہ پہنچ گئی ہو۔ کال کر کے دیکھتی ہوں۔“

اس نے بیگ سے موبائل نکالا۔ یہ وہی موبائل تھا جو کچھ عرصہ پہلے چچا نے اسے خرید کر دیا تھا، سر جھکا کر وہ شایہ کا نمبر ڈھونڈنے لگی جب۔۔۔۔۔۔۔۔

”سنیں۔۔۔۔۔“

کسی نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ وہ چونکی پھر پلٹی۔ موبائل والا ہاتھ پہلو میں گر گیا۔ سامنے والے انسان کو دیکھتے

Novels Hub

زینب از قلم طیبہ ساجد

ہی اس کے تاثرات بدلے۔ یہ وہی لڑکا تھا جو اسے کالج کے باہر کھڑا ہو کر دیکھتا تھا۔

”تم۔۔۔۔۔۔۔! کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔“

زینب کا لہجہ ایک دم خشک ہو گیا۔ تاثرات بھی سرد تھے۔ سامنے والا بھی اسے دیکھتے ہی چونکا تھا۔ اس کے

تاثرات میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی۔

”سوری، مجھے نہیں پتہ تھا یہ آپ ہیں۔۔۔۔۔“

وہ شرمندہ ہوا۔

”آپ کو کچھ کہنا تھا۔“

اس کے شرمندہ ہونے پر وہ تھوڑی نرم پڑی۔ ارد گرد سے لوگ گزرتے جا رہے تھے۔ وہ قدرے سائیڈ پر کھڑے تھے۔

”کہنا کچھ اور تھا۔ لیکن اب میں کچھ کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

زینب نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ کچھ دیر کیلئے اسے ارد گرد کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ وہ لڑکا کچھ دیر چپ رہا جیسے الفاظ جوڑ رہا ہو پھر وہ بولا۔

”دیکھیں مس، آپ اس دن غلط سمجھ گئی تھی میرا مقصد آپ کے ساتھ کچھ غلط کرنا نہیں تھا۔ میں اپنی کزن کو لینے کالج آتا تھا اور رہی بات آپ کو دیکھنے کی تو میں نے ایک دفعہ اپنی کزن کے موبائل میں آپ کی تقریر سنی تھی جو آپ نے کالج کے کسی تقریری مقابلے میں کی تھی۔ میں بس ویسی ہی کوئی تحریر لکھوانا چاہتا تھا آپ سے

----- اس سے زیادہ کچھ نہیں خیر-----“

وہ لمحے بھر کو رُکا۔ زینب کے چہرے کے تاثرات پہلے سے مختلف تھے پھر وہ جھجھکتے ہوئے بولا۔

”اور مقصد آپ کو چھونا نہیں آپ کو بچانا تھا۔ اس دن جس درخت کے نیچے ہم کھڑے تھے وہاں اوپر شہد کی مکھیوں کا گھر تھا۔ آپ کے ہاتھ پر بھی ایک مکھی بیٹھی تھی بس اسی کو ہٹا رہا تھا لیکن آپ غلط سمجھ گئی۔“

بات ختم کر کے اس نے زینب کو دیکھا۔ اس کا چہرہ وہ نہیں تھا جو بات کرنے سے پہلے اس نے دیکھا تھا۔

”سوری۔۔۔“

زینب کو احساس ہوا تو خفیف سا ہوتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

”غلطی صرف آپ کی نہیں میری بھی تھی۔ مجھے آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ میں وہاں کیوں کھڑا ہوتا ہوں۔“

اس لڑکے نے بات سمیٹ دی۔ پھر بولا۔

”آپ کا فرسٹ ڈے ہے۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔“

مختصر کہہ کر وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسی اس لڑکے میں فی الوقت کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں وہ تو شایہ کو کال کرنے والی تھی لیکن اس لڑکے کی وجہ سے اسے رُکنا پڑا۔ وہ جانے کیلئے مڑی جب اس نے پھر کہا۔

”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔۔۔“

وہ پوری اس کی طرف گھومی اور سینے پر بازو لپیٹ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا آپ کا بھی فرسٹ ڈے نہیں ہے۔۔۔؟“

”در اصل میں پہلے بھی کافی دفعہ یونیورسٹی آچکا ہوں اپنے کزن کے ساتھ۔ کافی راستے معلوم ہیں مجھے۔“
وہ کان کھجاتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں راہداری کے آخر میں ایک پلر کے ساتھ کھڑے تھے۔
”بس مجھے بتادیں میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کہاں ہے۔۔۔؟“

”حسین اتفاق۔۔۔۔۔۔“

اس کی بات سن کر وہ بڑبڑایا۔ زینب نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔
”جی۔۔۔۔۔“

”نہیں وہ میں کہہ رہا تھا آپ میڈیکل کی سٹوڈنٹ ہیں۔۔۔؟“
”جی۔۔۔۔۔“

”پھر یہ اتفاق ہی ہے کہ میں بھی میڈیکل کا سٹوڈنٹ ہوں۔۔۔۔۔“
”اوہ گڈ۔۔۔۔۔“

وہ مختصر جواب ہی دے رہی تھی۔

”میڈیکل کا ڈیپارٹمنٹ اس طرف ہے۔“
لڑکے نے ہاتھ سے دائیں طرف اشارہ کر کے بتایا۔

”تھینک ہو۔۔ میں اب چلتی ہوں۔“

”سین۔۔۔۔۔“

وہ مڑنے ہی لگی تھی جب اس کی آواز پر باد لنبخو استہ دوبارہ رکی۔

”یونی میں دوست بہت ضروری ہوتے ہیں اور پھر ہمارا تو ڈیپارٹمنٹ بھی سیم ہے۔ ملاقات ہوتی رہے گی۔ کیا

آپ مجھ سے دوستی کریں گی۔۔۔؟“

اس نے دوستی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔ زینب نے حیرت سے اس کے بڑھائے ہاتھ کو دیکھا۔ اس نے تو کبھی لڑکوں سے بات بھی نہیں کی تھی دوستی تو دور کی بات تھی۔ اس کی زہن میں چند منٹ پہلے موحد کے کہے الفاظ گونجے۔

”میری تم پر نظر رہے گی۔“

لیکن پتہ نہیں کیسا اثر تھا اس لڑکے کا۔ سادگی اور شرافت سے بولتا وہ لڑکا اسے اچھا لگا تھا۔ عجیب کیفیت تھی اس کی۔ پھر موحد کی آواز کو جھٹکتے ہوئے اس نے ہمت کر کے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے بڑھے ہاتھ کو تھام لیا۔

”زینب خالد۔۔۔۔“

اس نے خود ہی اپنا تعارف کروایا۔

”بندہ ناچیز کو ’ارسم ابراہیم‘ کہتے ہیں۔۔۔“

ارسم نے سر کو خم دیتے ہوئے اپنا تعارف بھی کروایا تھا۔

جاری ہے

اگلی قسط دو ہفتے بعد